© rasailojaraid.com

اسلامی ریاست اور عہدِ جدید

عبدالحمید صدیقی

اسلام کے مخالفین نے عوام میں، اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اسلامی ریاست کے متعلق بڑی عجیب وغریب قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے ان کے ذہن میں کچھ اس طرح کا تصور قائم کیا ہے کہ اسلامی ریاست کے معرضِ وجود میں آتے ہی قرونِ وسطیٰ اپنی ساری پس ماندگی اور تاریک خیالی کے ساتھ واپس پلٹ آئے گا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کیا جس دور کو یہ لوگ پس ماندہ کہتے ہیں وہ فی الحقیقت پس ماندہ تھا یا جس چیز کو آج پس ماندگی اور فرسودگی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ واقعی پسماندگی اور فرسودگی ہی ہے لیکن مخالفین اسلامی ریاست کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں وہ بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ مملکت سائنس اور صنعتی ترقیوں سے یکسر محروم ہو گی بلکہ اس کی حدود میں ترقی کے سارے نشانات کو حرفِ باطل کی طرح مٹا دیا جائے گا۔ ملک کو ریگستان بنا دیا جائے گا جس میں صرف اونٹ چلا کریں گے۔ ہوائی جہاز، ریل، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن اور بجلی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کی جگہ ہر طرف گھوڑے، گدھے چلتے پھرتے اور تیل کے چراغ جلتے نظر آئیں گے۔ ہسپتالوں کی جگہ تعویذ گنڈوں کی دکانیں سجائی جائیں گی اور یونیورسٹیوں کالجوں اور سکولوں کو چٹائیاں بچھے ہوتے مدرسوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اسلامی ریاست کا یہ گھناؤنا تصور جس کا حقیقت سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں بڑی عیّاری کے ساتھ اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ اس مملکت کو محض خام خیالی اور اس کے قیام کی کوشش کو اندھا جنون سمجھیں۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ بالعموم اس تمثیل کا سہارا لیتے ہیں کہ جس طرح وہ لباس جو ایک پانچ سالہ بچے کے لیے تیار کیا گیا ہو، پچیس سالہ نوجوان کے جسم پر راست نہیں آسکتا اسی طرح یہ بات بھی عقل وفکر کے منافی ہے کہ وہ قوانین اور ضابطے جو چھٹی یا ساتویں صدی کے پس ماندہ معاشرے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی حد تک مفید ثابت ہوئے تھے ان سے آج کے ترقی یافتہ دور میں کوئی رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ چونکہ یہ دلیل اور یہ تمثیل بار بار پیش کی جاتی ہے اس لیے ہم سب سے پہلے اسی کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ لباس کو قانون پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ لباس کی لمبائی چوڑائی محدود ہوتی ہے لیکن قانون میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں نت نئے مسائل کے بارے میں اجتہاد اور نئے حالات کی روشنی میں ان کی تحقیق اس حقیقت پر شہادت فراہم کرتی ہے کہ قانون کبھی جامد نہیں ہوتا بلکہ اپنی مخصوص روح اور مزاج کے ساتھ ایک خاص نہج پر ترقی کرتا رہتا ہے اس لیے قانون کے بارے میں لباس کی تمثیل بالکل غلط ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی صحیح تمثیل دی جا سکتی ہے تو وہ روح اور جسم کے اعضاء کی ہے۔ جس طرح روح جس سے انسان کی زندگی وابستہ ہوتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل نہیں ہوتی بالکل اسی طرح کسی قوم کے اساسی تصورات جن سے اس کی اجتماعی زندگی عبارت ہوتی ہے کبھی نہیں بدلتے بلکہ جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ باقی رہی ہیئتِ اجتماعی کے لیے اصول و ضوابط تو ان کی حیثیت بھی لباس کی نہیں بلکہ اعضاء و جوارح کی سی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ اگر روح انسان کے اندر جوں کی توں قائم رہ سکتی ہے، اگر اس کے وہ اعضاء جو اسے پیدائش کے وقت عطا کیے گئے تھے تنومند ہو کر بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں، تو آخر کیا وجہ ہے کہ کسی قوم کے اساسی تصورات اور اس کے اجتماعی ڈھانچوں کو جو اس کے تصورات کا مظہر ہی ہوتے ہیں، بوسیدہ کہہ کر اسے انہیں ترک کرنے کی تلقین کی جائے؟ کیا انسانوں کو اپنی روح اور اپنے اعضاء کو بدلنے کا کبھی کسی دانشمند شخص نے مشورہ دیا ہے؟

اسلامی ریاست کے بارے میں دوسری غلط فہمی یہ پھیلائی جاتی ہے کہ یہ ایک پس ماندہ دور کی یادگار ہے اور ترقی پذیر معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ لیکن ہمیں اس سلسلے میں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ترقی اور پس ماندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کن دو مختلف کیفیات کے نام ہیں؟ کیا کوٹ پتلون پہننا اور سر بفلک عمارات تعمیر کرنا ترقی ہے اور سادہ مگر صاف ستھری زندگی بسر کرنا پس ماندگی ہے؟ ترقی اور پس ماندگی پر اگرچہ کتابوں اور مقالات کی صورت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جس ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نتیجے پر قریب قریب سبھی مفکرین متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور اس کی ہمدردی اور محبت کے دائرے میں جس قدر وسعت ہوگی اسی نسبت سے انسان زیادہ ترقی یافتہ کہلانے کا مستحق ہوگا اور جس نسبت سے اس کے خیالات محدود اور اس کی ہمدردی اور محبت کا دائرہ تنگ ہوگا اسی تناسب سے وہ پسماندہ ہوگا۔ ہم اس تعریف کو اگرچہ جامع اور مانع نہیں سمجھتے لیکن چونکہ مغربی مفکرین کے نزدیک یہ متفق علیہ ہے اس لیے ہم اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ترقی کے دعویداروں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس بات کا خود فیصلہ کریں کہ کیا دورِ جدید واقعی ترقی کا دور ہے؟ کیا آج کے انسان کے خیالات ماضی کے انسانوں کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور اس کی محبت اور ہمدردی کا دائرہ زیادہ کشادہ ہے؟ اگر کسی شخص کی آنکھوں کو دورِ جدید کی ظاہری چمک دمک نے بالکل خیرہ نہیں کر دیا تو وہ کبھی اس دور کو ترقی یافتہ دور نہیں کہہ سکتا۔ آج دنیا کا کونسا ایسا ملک اور معاشرہ ہے جہاں انسانی مسائل پر قومی مفادات سے بلند تر ہو کر خالص انسانی بنیادوں پر غور و فکر کیا جاتا ہے؟ خیالات کی وسعت کا اظہار خیالی خاکوں کی ترتیب سے نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے وسیع تر مفادات کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کی عادت اور اس کے لیے صحیح لائحۂ عمل کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی ہمدردی اور محبت کے دائرے کی وسعت کا اصل معیار "انسانیت دوستی" کے محض کھوکھلے نعرے نہیں بلکہ عمل ہے۔ دنیا کے غالباً سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ترقی یافتہ قوموں کے بہترین نمائندے انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام کے دعوے کے ساتھ اقوامِ متحدہ میں جمع ہیں۔ مگر ان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود وہاں قدم قدم پر تنگ نظری، تعصب اور مفاد پرستی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مظلوم اور کمزور طبقوں اور ممالک کو آج اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس طرح کہ پرانے زمانے میں ظالم حکمران بنایا کرتے تھے۔ کیا موجودہ دور کے جارحانہ قوم پرستی کے نظریات، طبقاتی کشمکش اور تشدد کے ذریعے انقلابات کے تصورات انسانیت دوستی کے مظہر ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں بھی مفاد پرستوں نے اپنے ناجائز مفادات کے حصول کی خاطر اور بہت سے بادشاہوں نے اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے کی غرض سے انسانوں پر مظالم ڈھائے۔ مگر عام انسانوں نے ان کے ظلم و استبداد کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ تاریخ میں انہیں کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ یہ

© rasailojaraid.com

فخر صرف موجودہ دور کو حاصل ہے کہ اس نے جارحانہ قوم پرستی کو قوم پروری، طبقاتی تصادم کو عدل و انصاف، سیاسی، معاشرتی اور معاشی جکڑ بندیوں کو فلاحی اقدام اور جبر و استبداد کو منصوبہ بندی سے تعبیر کر کے انسانیت کو سخت دھوکہ دیا ہے۔

اِن ابتدائی گزارشات کے بعد اب اسلامی ریاست کے چند بنیادی اصولوں کی نشاندہی کر کے ہم یہ بتاتے ہیں کہ اس ریاست کے قیام سے دنیا میں کس نوعیت کا فکری روحانی اور اخلاقی انقلاب رونما ہوگا۔

جو لوگ بھی اسلام سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلامی ریاست کا سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اس میں حاکمیت نہ تو کسی فرد کی ہے، نہ کسی خاندان کی، نہ کسی طبقے کی، نہ قوم کی، نہ عوام کی، نہ پوری انسانیت کی، بلکہ صرف خدا کی ہے۔ حاکمیت خداوندی کو بعض لوگوں نے محض ایک دلکش تصور سمجھ رکھا ہے اور اس کی عملی افادیت پر بہت کم غور کیا ہے۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ حیات آفریں اور انقلاب انگیز تصور انسان کے سامنے کبھی پیش ہی نہیں ہوا۔ اس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ فرماں روائی کا حق صرف خالقِ کائنات کو حاصل ہے۔ یہ تصور دوسری مذہب پسند قوموں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کی فرمانروائی کا دائرہ صرف عالمِ طبیعیات تک محدود ہے اور انسان اپنی زندگی کے اختیاری دائرے میں خدا کی فرمانروائی سے یکسر آزاد ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے انسان کی معاشرتی سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کے لیے نہ تو احکامِ خداوندی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ان کی پابندی کا خیال ان کے دل میں کبھی پیدا ہوا ہے۔ اس اختیاری دائرے میں وہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں یا علمی اصطلاح میں وہ انسان کی حاکمیت کے قائل ہیں۔

خالقِ کائنات کے بارے میں یہ تصور کتنا غلط ہے کہ یہ تو مان لیا جائے کہ اس نے عالمِ طبیعیات کے لیے قوانین اور ضابطے وضع کیے ہیں اور ان کی پابندی کی وجہ ہی سے کائنات کی ہر چیز خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دے رہی ہے۔ مگر انسان کو اس نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے لیے جس طرح کے ضابطے اور اصول چاہے وضع کرتا رہے۔ اسلام اس تصور کو بالکل باطل سمجھتا ہے اور وہ اس بات کا دعویدار ہے کہ خالق نے جس طرح عالمِ طبیعیات کے اصول دیئے ہیں اور اس عالم کو ان کا پابند بنایا ہے بالکل اسی طرح اس نے

© rasailojaraid.com

انسانی رُشد و ہدایت کے لیے بھی واضح احکام صادر فرمائے ہیں اور پھر اپنے انبیاء علیہم السّلام کی وساطت سے ان کے عملی مضمرات سے بھی انسانوں کو پُوری طرح آگاہ کر دیا ہے تاکہ ان کی پابندی کرنے میں انہیں کسی مقام پر کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

دَورِ جدید میں انسانوں کی اکثریت شاید کائنات کی اس بنیادی حقیقت کو بھول چکی ہے یا جان بوجھ کر اُس نے اسے اپنی نگاہ سے اوجھل کر دیا ہے، اسی وجہ سے اُس نے خدا کی حاکمیت ماننے کے بجائے انسان کی حاکمیت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال رکھا ہے۔ انسان کی حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ اس کی عملی جد و جہد کی قدر و قیمت، اس کے مقصد و منہاج یا دوسرے لفظوں میں اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے خود انسان متعیّن کرے۔ یہ فساد کا وہ اصل سرچشمہ ہے جس نے انسانی زندگی کو سزا یا عذاب بنا رکھا ہے۔ اس عذاب کی لاتعداد صورتیں اور لامحدود دائرے ہیں مگر ان میں چند صورتیں اور دائرے بڑے نمایاں ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

لادینیت کے علمبردار بڑے طنطنے کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ مذہب نے انسان کو ذلت و خواری کے نہایت پست مقام تک دھکیل رکھا تھا، یہ دَورِ جدید کا فیضان ہے کہ انسان بندگی کے نچلے مقام سے بلند ہو کر اب حاکمیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوا ہے اور اب وہ مذہبی توہمات کے چنگل سے اور مذہبی طبقوں کے تسلط سے آزاد ہو کر اپنی دنیا خود اپنے مفاد کے مطابق تعمیر کرتا ہے۔ یہ دعویٰ تو بڑا دلکش ہے مگر خدا کی حاکمیت کو ترک کر کے اُس نے عملی طور پر اپنے آپ کو نمرود کی خدائی کا غلام بنا لیا ہے۔ جہاں تک نعرے کا تعلق ہے وہ تو انسان کی حاکمیت ہی ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ پُوری انسانیت ایک ہی شیرازہ بندی کے ساتھ اپنے لیے ضابطۂ حیات مرتب نہیں کر سکتی، اس لیے سب سے پہلے تو وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کی بنیادوں پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوتی ہے پھر ہر حصے کے عوام اس زعم میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں کہ حاکمیت کے حقوق انہیں حاصل ہیں۔ مگر اس پہلی منزل پر ہی انسانیت کو دو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچتے ہیں۔

ایک یہ کہ بالکل مصنوعی اور اتفاقی امتیازات کی بنا پر انسانیت مختلف متحارب گروہوں میں بٹ جاتی ہے جن میں سے ہر گروہ دوسرے کو مٹانے اور دبانے کے لیے ہر لحظہ بیتاب رہتا ہے۔ کیونکہ اگر ان کے مابین مستقل عداوت اور دشمنی موجود نہ رہے تو ان کا الگ قومی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گروہ کے چالاک اور عیار لوگ برابر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دوسرے گروہوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات اُبھارتے رہیں۔ انسانی اخوت کی بنیاد اس پہلے قدم پر ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ انسان کی حاکمیت قبول کر لینے سے ہر قوم یا گروہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے دوسرے کے خلاف اپنے قلب و دماغ میں نفرت کے بیج بوتا رہے اور پھر تصادم کے مواقع پیدا کر کے اس کی آبیاری کرتا رہے۔

دوسرا نقصان یہ پہنچتا ہے کہ قومی مفاد کے نام پر ہر قوم میں ایسے لوگ تختِ اقتدار پر متمکن ہوتے رہتے ہیں جو اپنی قوم کے قلب و دماغ میں منفی جذبات پالنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہوں۔ اس طرح دنیا میں آج ہر قوم کی سربراہی و قیادت عملاً ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے جو اچھے خیالات اور پاکیزہ جذبات سے یکسر عاری ہیں اور انسانیت دشمنی جن کے ذہنوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

بعض اوقات یہ بات عجیب معمہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ جن اشخاص کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا جن کے خیالات کو انسانیت کے لیے مفید سمجھتے ہیں انہیں اقتدار کی مسند پر فائز کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس کی ایک واضح مثال انگلستان کے فلسفی برٹرینڈ رسل کی ہے۔ انگریز قوم کے دل میں اس شخص کا بڑا احترام تھا۔ سرکار کی طرف سے بھی اسے مختلف خطابات عطا کیے گئے تھے۔ اس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتیں اور اُس کے خیالات کی بیشتر حلقوں میں پذیرائی ہوتی۔ مگر اسے کبھی اس بات کا موقع نہ دیا گیا کہ اجتماعی زندگی کا جو نقشہ اس کے پیشِ نظر ہے اور انگلستان کے اندر یا باہر جس کی تعریف و توصیف بھی کی جاتی ہے اس کو اس نقشے کے مطابق کام کرنے کے عملی مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انگریز جس جارحانہ قوم پرستی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی جس تنگ نظری کا شکار ہے اس کی بنا پر اسے یہ بات کسی صورت بھی قبول نہ تھی کہ قومی مفاد کے دائرے سے نکل کر انسانی بنیادوں پر سوچنے والا کوئی شخص عملاً اس کی سربراہی کے لیے آگے بڑھے۔ اس شخص کو رسمی عزت و احترام کے باوجود نہ صرف حکومت کے ایوانوں سے دور رکھا گیا بلکہ کئی مرتبہ اسے جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ آج دنیا میں جو ہمہ گیر فساد اور بگاڑ رونما ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خدا کی حاکمیت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے قومی مفادات کی پرستش شروع ہو گئی ہے اور ان مفادات کی حفاظت و پاسبانی کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف قوموں نے ایسے لوگوں کو قیادت و سیادت کا منصب سونپا ہے جو بڑے خود غرض، تنگ نظر، مفاد پرست اور ظالم ہیں۔ ممکن ہے سربراہی کے لالچ میں وہ اپنے ان منفی رجحانات و احساسات کو اپنی قوم سے کسی حد تک چھپانے میں کامیاب ہوں مگر دوسری قوموں کے ساتھ وہ کبھی بھی انسان دوستی اور عدل و انصاف کا رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ انہیں برباد کرنے میں پوری قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی ہر طرح کی ظالمانہ کارروائیوں پر اترتے ہیں

صحیح بات تو یہ ہے کہ جس دن سے انسان حاکمیتِ خدا کے تصور سے بیگانہ ہوا ہے اسی دن سے انسانیت کی رہنمائی سے ایسے لوگ بے دخل ہو گئے ہیں جنہیں مذہب کی اصطلاح میں شہداء علی الناس اور حق و انصاف کے علمبردار کہا جاتا ہے۔ ان نیک نفس اور پاک طینت لوگوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے زندگی کی گاڑی چلانے والوں میں آج انسانیت کا کوئی سچا خیر خواہ نظر نہیں آتا۔ قوموں کے معاملات چونکہ فساق و فجار کے ہاتھ میں ہیں اس لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کسی معاملے کو حق و انصاف کے مطابق طے نہیں کیا جاتا۔ اجتماعی زندگی چالاکی، عیاری اور زبردست آزاری کا ایک مکروہ کاروبار بن گئی ہے۔ انسانیت پر سے یہ عذاب اسی صورت میں ٹل سکتا ہے کہ انسان، انسان کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا کی غلامی قبول کرے اور اجتماعی زندگی کو مفاد پرستی کی بنیادوں پر استوار کرنے کے بجائے انسانی اخوت اور حق و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرے۔ اسلامی ریاست کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے کیونکہ اس کے معرضِ وجود میں آنے ہی سے حیاتِ اجتماعی میں مفاد پرستی کی جگہ انسانیت نوازی، مکر و فریب کی جگہ خلوص اور دیانتداری، تنگ نظری اور تعصب کی جگہ وسعتِ قلب و نظر پیدا ہو گی اور انسان کسی گروہ یا قوم کا بندہ یا کسی مفاد کا بندہ بننے کے بجائے رب العالمین کا بندہ بن کر پوری انسانیت کے لیے اپنے دل میں جذبۂ محبت اور خیر خواہی پال کر حق کے ساتھ سرگرم عمل ہو گا۔ دورِ جدید میں اگر کوئی اجتماعی قوت انسانیت میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کر سکتی ہے تو وہ صرف وہی ریاست اور قوم ہو سکتی ہے جو جارحانہ قومیت کے منفی جذبات سے یکسر عاری ہو اور انسانوں کے ساتھ انسانیت کی وسیع تر بنیادوں پر معاملہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی ریاست کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے دنیا میں اُن اخلاقی اقدار کو فروغ ہوتا ہے جو حیاتِ اجتماعی میں توازن اور ٹھہراؤ پیدا کرتی ہیں۔ جب کسی مملکت میں حاکمیت انسان کی تسلیم کی جاتے گی تو قدرتی طور پر اس میں انسان کے بنائے ہوئے ضابطے اور قوانین نافذ ہونگے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے سارے عوام ایک ہی جیسی قوت اور ایک جیسے اختیارات کے ساتھ تو قانون سازی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ کام انہیں مجبوراً اپنے میں سے ایک گروہ کو ہی سونپنا پڑتا ہے۔ یہ گروہ اس کے لیے اپنے خیال کے مطابق ضابطۂ حیات مرتب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں دو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ایک تو انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کو کبیر نظر انداز کر کے محض انسانیت کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ضابطہ تشکیل دے سکیں۔ انسان میں فطری طور پر اتنی مکمل بے لوثی نہیں آسکتی کہ وہ اپنی ذات سے بالکل الگ ہو کر سوچے۔ دوسرے اسے اپنی سربراہی قائم رکھنے کے لیے معاشرے کے ان بارسوخ افراد اور مضبوط گروہوں کی تائید کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بل پر وہ اس مقام پر زیادہ دیر تک فائز رہ سکے۔ اس لیے وہ لازمی طور پر آئین و قانون کی تشکیل میں اپنے ان مؤید گروہوں اور طبقات کا خیال رکھتا ہے اور نظامِ حیات اس انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اس کے حامی طبقوں کو زیادہ سے زیادہ دنیوی مراعات حاصل ہوں۔ اس لیے انسان جو نظام ترتیب دیگا اس میں لازمی طور پر بعض طبقوں کے حقوق پامال ہوں گے اور بعض کو اپنے جائز حصے سے زائد فوائد حاصل ہونے کا التزام ہوگا۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ضابطۂ حیات میں تمام انسانوں کے ساتھ پوری طرح عدل و انصاف کا معاملہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک معاشرے کے اندر ہی ایک دوسرے کے مخالف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح ملک کے اندر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور متوازن اور جامع نظامِ حیات نہ ہونے کی وجہ سے ملک مستقل طور پر بدامنی کا شکار رہتا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں آپ کسی ملک کا جائزہ لیں تو آپ وہاں بے چینی، اضطراب اور عدمِ تحفظ کی عام فضا پائیں گے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کا شاکی اور ہر طبقہ دوسرے سے برسرِ پیکار ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممکن ہے بعض ممالک میں دہشت اور خوف کی وجہ سے محرومی کے جذبات پوری شدت کے ساتھ زبان پر نہ آئیں یا اضطراب ہنگاموں کی کوئی خوفناک شکل اختیار نہ کر سکے۔ مگر ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن اور مخالف ضرور رہے گا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے برسرِ اقتدار طبقے آئین و ضوابط کا جو نظام بناتے ہیں ان میں بڑی جانبداری سے کام لیا جاتا ہے اور چند گروہوں اور طبقوں کی خوشنودی کی خاطر دوسروں کے حقوق بڑی بے دردی سے پامال کیے جاتے ہیں۔ غالباً اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر قانون کے بارے میں ایک مغربی مفکر نے یہ کہا تھا کہ قانون مکڑی کا جالا ہے جس میں اگر کوئی کمزور پھنس جائے تو وہ جکڑا جاتا ہے لیکن اگر کوئی مضبوط اور طاقتور اس کی گرفت میں آئے تو وہ اسے تار تار کر دیتا ہے۔

انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کے بارے میں اہلِ مغرب کا یہ تصور بالکل درست ہے کہ یہ طاقتور طبقوں کے تحفظ اور کمزوروں کی بے بسی کو جوں کا توں قائم رکھنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی تدوین میں اس امر کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے کہ بے بس محروم اور کمزور طبقوں میں ناانصافیوں کے خلاف کوئی شدید ردِ عمل پیدا نہ ہونے پائے اور وہ بغاوت کر کے کہیں اس پورے نظام کو درہم برہم نہ کر دیں۔

انسانی قانون کے اس غیر عادلانہ مزاج کو سمجھنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دیکھنا کافی ہے کہ اس میں کمزوروں کو اگر ان کا کوئی جائز حق ملتا بھی ہے تو وہ تگ و دو اور کشمکش کے بعد ملتا ہے۔ ستم زدہ طبقے ایک لمبے عرصے تک اپنی محرومیاں اور طاقتور طبقوں کی زیادتیوں کے خلاف دلوں میں نفرت پالتے ہیں۔ پھر ان دراز دستیوں کے خلاف ان کا اجتماعی شعور بیدار ہوتا ہے پھر وہ اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر طاقتور طبقوں میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی اور قانون کی مختلف دفعات اور شقیں انہیں پابند سلاسل کرتی اور انہیں ظلم و زیادتی کے خلاف آہ و فغاں تک کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ اس کے بعد جب یہ ستم زدہ لوگ طاقتور طبقوں کے احساسات بیدار کرنے اور انہیں جھنجھوڑنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو حکومت کی قوتِ قاہرہ ان کے خلاف سرگرم عمل ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور قید و بند کی اذیتوں اور گولیوں سے ان کا راستہ روکتی ہے لیکن اِس جبر و تشدد کے باوجود جب ان کی یلغار نہیں رُکتی اور یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ یلغار بغاوت کی صورت اختیار نہ کر لے تو پھر ان کے چند مطالبات مان کر انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا بنایا ہوا سارا قانون اور ضابطہ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھنے کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے ۔

اسلامی ریاست میں اس قسم کی نہ تو کوئی ناانصافی ہوتی ہے اور نہ مملکت کا دستور کسی قسم کے جبر و استبداد اور ناانصافی کو گوارا کرتا ہے ۔ رب العلمین ، جس نے انسان کو یہ قانون عطا کیا ہے وہ انسانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا خالق اور حاکم ہے ۔ اس کو سب کا مفاد ایک جیسا عزیز ہے ۔ اس لیے اس نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت عدل و انصاف کے ساتھ اس دستورِ حیات میں سب کے حقوق اچھی طرح متعین کر دیئے ہیں تاکہ کسی کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی نہ ہو سکے ۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں کسی طبقے کو اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑتی بلکہ مملکت خود اس بات کی فکر مند رہتی ہے کہ ہر فرد کو اُس کے جائز حقوق خود بخود بغیر اس کی کسی کاوش کے دھوپ اور ہوا کی طرح میسّر ہوں ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کا بوجھ سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں اِسی بات کی نشاندہی کی تھی :

الضعيف منكم قوى عندى حتى ازيح علته ان شاء الله [1]

تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ خدا کی مدد سے اس کی شکایت دور نہ کر دوں ۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا :

ولا يدع فقيراً في ولايته إلّا اعطاه ولا مديوناً الّا قضى عنه دينه ولا ضعيفاً الّا اعانه ولا مظلوماً الا نصره ولا ظالماً الا منعه عن الظلم ولا عارياً الا كساه كسوة [2]

اُن کی مملکت میں کوئی ایسا محتاج نہ چھوڑا جائے گا جس کی حاجت روائی نہ کی جائے ، کوئی مقروض ایسا نہ ہوگا جس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے ، کوئی کمزور ایسا نہ ہوگا جس کی مدد نہ کی جائے ۔ کوئی مظلوم ایسا نہ ہوگا جس کی حمایت نہ کی جائے ، کوئی ظالم ایسا نہ ہوگا جسے اس کے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸
[2] شرح شرعۃ الاسلام ۔ سید علی زادہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظلم سے باز نہ رکھا جائے اور کوئی ننگا نہ ہوگا جسے تن ڈھانپنے
کے لیے کپڑا نہ دیا جائے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست طاقتور طبقوں کے مفادات کے تحفظ اور بے بس طبقوں کو کچلنے کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آتی بلکہ کمزوروں اور بے بسوں کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے قائم ہوتی ہے۔ اِن کا تحفظ اس مملکت کے بنیادی فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

اگر عوام کے اندر یہ احساس پوری طرح پیدا ہو جائے کہ اُن کے ملک کا دستور و قانون کسی طبقے یا گروہ کی مرضی کا نمائندہ نہیں ہے اور نہ وہ مخصوص مفادات کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے بلکہ وہ اس ہستی کے احکام پر مبنی ہے جسے تمام انسانوں کی فلاح یکساں عزیز ہے اور اس نے یہ احکام عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے اور ہر فرد کے حقوق کی حفاظت اور نگہبانی کرنے کے لیے دیئے ہیں تو ان کے دل میں ایسے قانون اور دستور کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا اور اسے توڑنے کا خیال کرتے ہوئے بھی وہ اپنے ضمیر میں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھیں گے۔ دنیا کے تمام ممالک میں آج جو ہمہ گیر اضطراب نظر آتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملکوں کے عوام کا اعتماد آئین و قانون اور خود مملکت پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں یہ تاثر رکھتے ہیں کہ آئین طاقتور طبقوں کے ہاتھ میں محض ظلم کا ہتھیار ہے جسے وہ مملکت کی قوت کے ذریعے بے کسوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کے دلوں میں آئین اور مملکت کے لیے احترام کے بجائے اس کے خلاف حقارت و نفرت کا ایک نہ مٹنے والا جذبہ موجزن رہتا ہے اور ان دونوں کو نقصان پہنچانے میں انہیں راحت محسوس ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے دستور کی بنیاد چونکہ احکامِ الٰہی پر ہوتی ہے اور یہ معاشرے میں ظلم و استبداد کا ہتھیار بننے کے بجائے عدل و انصاف کا علمبردار ہوتا ہے اس لیے عوام کے دلوں میں اس کے لیے بے پناہ جذبۂ محبت و عقیدت موجود رہتا ہے اور وہ اس کی پابندی کو اپنے لیے دنیوی فلاح اور اُخروی سعادت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو دنیا میں انسان کے ساختہ تمام دساتیر اور ضابطے قومی اور مادی مفادات کے نقطۂ نظر سے مرتب ہوتے ہیں اس لیے ملک کے اندر اور باہر معمولی نوعیت کے معاشی تغیرات سے دستوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھانچوں میں زبردست تبدیلیوں کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ جب ہر فرد یا گروہ زندگی کا رہنما اصول یہ قرار دے کہ اُسے دوسروں کے حقوق غصب کرکے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی مفادات کے حصول کا التزام کرنا ہے تو ملک کی معاشی ہیئت میں معمولی تبدیلیوں سے بھی آئین اور دستور میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاشرے کی اخلاقی اقدار اور خوب و ناخوب کے پیمانے بھی ہر وقت بدلتے رہیں گے اور ملک کے اندر کوئی مستقل اخلاقی معیار یا شرافت کی پائیدار روایات قائم نہ ہو سکیں گی۔ لادینی ریاستیں درحقیقت اُس اخلاقی لنگر سے بالکل محروم ہوتی ہیں جو معاشرے میں توازن اور اقدارِ حیات میں استقلال پیدا کر سکے۔ اسی بنا پر تغیر کی معمولی لہر ان کے پورے نظام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے۔ بعض انجان لوگ اسے عوام کی فتح قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ انسان کی بڑی بدبختی ہے۔ سائنسی ایجادات اور انکشافات کی وجہ سے اگر تجربہ گاہوں کے ساز و سامان بدلتے رہیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن ہر آن بدلتی ہوئی اقدارِ حیات سے انسانیت کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

آپ کسی مادی شے کی نوعیت اور اس کی قدر و قیمت کا سائنسی تجزیوں کی مدد سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں مگر اخلاقی اقدار کے معاملے میں اس طرز کے تجزیے نہیں کیے جا سکتے۔ کسی فعل یا عادت یا معاشرتی رجحان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ایک لمبی مدت تک غور و فکر کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر اس کے مختلف گوشے اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا اس وقت مزدور طبقہ بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ سرمایہ داروں نے ان کی اس بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت کا جی بھر کر استحصال کیا اور مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس بات کا تجزیہ تو بالکل آسان ہے کہ عورتوں میں چونکہ اجتماعیت کا شعور بہت کم ہوتا ہے اس لیے ان کی محنت بڑے سستے داموں خریدی جا سکتی ہے، لیکن عورتوں کے معاشی میدان میں براہِ راست عمل دخل سے جو لاتعداد اخلاقی مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں اور ان سے انسانیت کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ دیکھیے کہ کسی ملک کو جلد از جلد صنعتی ترقی دینے کے لیے یہ ایک کامیاب حربہ ہے کہ ملک پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آمریت مسلط کر دی جائے اور پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے سارے ذرائع حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اس ترقی کا سبب ظاہر ہے کہ انسان کو جب حیوان کی سطح پر رکھ کر اس سے بے تحاشا کام لیا جاتا ہے تو اس سے قدر زائد کی بہت بڑی مقدار حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے جسے صنعتی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجزیہ بالکل آسان اور سادہ ہے۔ مگر انسان کو اس طرح حیوان بنانے کے اخلاقی اور روحانی نقصانات کے صحیح اندازے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ انسان کو اس اشتراکی تجربے سے جو اخلاقی نقصانات پہنچیں گے ان کی صحیح نوعیت عرصۂ دراز کے بعد ہی سامنے آئے گی اور طویل اور صبر آزما مراحل سے گزر کر ہی انسان اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اس نے اس تجربے میں کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ انسان کے پاس وحی الٰہی اور الہام ہی ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس کی مدد سے وہ کسی فعل کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے اور اسے بربادی سے بچنے کے لیے بار بار بربادی کے مراحل سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے وحی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ انسانی تجربات کی کفایت ہے ITISAN ECONOMY OF HUMAN EXPERIENCE یعنی جس نتیجے پر انسان لاکھوں ٹھوکریں کھا کر بعد از خرابیٔ بسیار پہنچتا ہے قادرِ مطلق انسان کو اس کے متعلق پہلے قدم پر ہی آگاہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست جس کا دستور قرآن و سنت کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے اس میں انسان بربادیوں کے ان روح فرسا تجربات سے نہیں گزرتا بلکہ اپنی قوتوں کو وحی و الہام کی روشنی میں تعمیری کاموں پر لگاتا ہے اور دنیوی اور اُخروی فلاح حاصل کرتا ہے۔

تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل اور جلد دوم میں حسبِ ذیل مقامات کی تصحیح کر لی جائے:

جلد اوّل: صفحہ ۴۰۶ سطر ۸ ”اور اس کے رسولوں پر“ کے بجائے ”اور اس کے رسول پر“

جلد دوم: صفحہ ۲۱۲ سطر ۱۲ ”اور اس کے رسول کی“ کے بجائے ”اور اللہ اور اس کے رسول کی“

© rasailojaraid.com